جہانِ غالب

شش ماہی

جلد اول شمارہ—۱

نگراں

خواجہ حسن ثانی نظامی

مدیر

ڈاکٹر عقیل احمد

غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین اولیاءؒ، نئی دہلی

شمیم حنفی

تفہیم غالبؔ کے مسائل اور ہمارا عہد

یہ بات کہی تو تھی میرؔ صاحب نے کہ "سہل ہے میرؔ کا سمجھنا کیا، ہر سخن اس کا اک مقام سے ہے۔" لیکن میرؔ سے زیادہ یہ قول غالب پر صادق آتا ہے۔ غالبؔ اپنے زمانے کے ایک چیلنج تھے، ہمارے لیے بھی ایک چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اردو شاعری کی پوری تاریخ میں مشکل گوئی کا الزام کسی اور بڑے شاعر پر عاید نہیں کیا گیا۔ کسی نے اپنے افکار اور اسالیب بیان کی سطح پر اتنے اعتراضات کا سامنا نہیں کیا، جتنا کہ غالبؔ نے۔ شاعری جیسی بے ضرر سرگرمی کے باعث کسی کی اتنی مخالفت نہیں ہوئی، جتنی کہ غالبؔ کی۔ ناصر کاظمی نے میرؔ کی بابت یہ کہا تھا کہ ہر بڑا شاعر اپنے بعد بہت سے قبیلے چھوڑ جاتا ہے۔ پھر اس کے کلام کا یا سوانح کا جو بھی حصہ کسی کے ہاتھ لگا، وہ اسے لے بھاگتا ہے۔ اس کی تعبیر اتنے مختلف پیرایوں سے اور اتنی متضاد سطحوں پر کی جاتی ہے کہ تعبیر کی کثرت میں حقیقت کہیں گم ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہم تک اگر کچھ پہنچتا ہے تو ایک ادھوری سچائی، ایک جزوی حقیقت، تصویر کا ایک نقطہ یا صرف ایک لکیر۔ پھر محقق ہو یا نقاد، اسی ایک لکیر کو پیٹنے میں عمر گزار دیتا ہے۔

غالب جس دنیا کے باسی تھے، اس دنیا سے غالبؔ کا تعلق ٹوٹے ہوئے بھی آج (2005ء) ایک سو چھتیس برس گزر چکے ہیں۔ گویا کہ کائنات کا، انسانی وجود کا، وقت کا اور حقیقت کا جو تصور غالب رکھتے تھے، وہ ایک صدی سے زیادہ پرانا ہو چکا ہے۔ اگر نسخۂ حمیدیہ یا غالبؔ کے نمائندہ اشعار کے حوالے سے بات کی جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالبؔ نے جس ذخیرۂ الفاظ سے کام لیا، اور اظہار و بیان کا جو پیرایہ اختیار کیا، وہ ہمارے عہد تک پہنچے

پہنچتے متروک تو نہیں ہوا ہے، مگر زیادہ مقبول بھی نہیں ہے۔ غالبؔ کے رنگ میں شعر کہنے والے، ان کے اپنے زمانے میں بھی بس اکا دُکا ہی رہے ہوں گے۔ ہمارے زمانے کے بھی گنتی کے کچھ شاعروں نے ان کی روش اختیار کی ہے۔ یہاں مثال کے طور پر میں صرف دو نئے شاعروں کے کلام کا کچھ نمونہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ایک تو نئی نظم کے سب سے معروف شاعروں میں شامل، افضال احمد سید ہیں جنھوں نے ''چھینی ہوئی تاریخ'' کی نثری نظموں سے اپنے سفر کی شروعات کی اور طرزِ احساس کو رنگارنگ تجربوں سے ہوتے ہوئے، اپنی غزلوں کے دیوان ''خیمۂ خواب'' تک پہنچے۔ افضال احمد سید کی غزلوں کا انداز حسبِ ذیل ہے۔

کیا ساعتِ مسعود تھی جس وقت مرا دل
طرزِ سخنِ میرزا نوشاہ پہ آیا

غالبؔ کی تقلید نے افضال احمد سید کی غزلوں میں جو رنگ بکھیرے ہیں، ان کی کچھ مثالیں بھی ملاحظہ ہوں:

اُس شوخ کے ترکش کا میں وہ تیرِ خطا ہوں
جو لوٹ کے پھر اس کی کمیں گاہ پہ آیا

اک عکس چاہیے ہے سرشیشۂ شکست
وہ عکس، بے ارادہ و تدبیر چاہیے

رات اک خیمۂ غم آتشِ خاموش پہ تھا
کچھ ہوائے خنک آثار عنایت کرنے

بہ نوک تیز ہے میرا نوشتۂ تقدیر
کہ مجھ سے ممکن و موہوم میں خلل آیا

سرابِ عمر سے اک جست میں گزر جاؤں
صلاح رمز شناسانِ خاک و آب سے ہے

اب لطف مجھے ماتم رفتہ سے زیادہ
بربادیِ آئندہ و امروز میں آیا

ان شعروں پر ایک گہری وجودی صورت حال کا سایہ ہے، انسانی تجربوں اور واردات کی وہ نوعیت، جسے پہلی عالمی جنگ (1914ء) کے بعد یورپ میں پنپنے کا موقع ملا اور ہماری ادبی روایت میں جسے ترقی پسند تحریک کی کہولت اور پژمردگی کے دور میں قبولیت ملی۔ اس طرح سے دیکھا جائے تو یہ اشعار بظاہر روایتی آہنگ اور اسلوب رکھتے ہوئے بھی ہمیں نئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان سے یہ حقیقت بھی رونما ہوتی ہے کہ نئے تخلیقی تجربے صرف نئی لفظیات کے پابند نہیں ہوتے۔ اصل مرحلہ ہوتا ہے پرانے لفظوں میں ایک نئے اندرونی ربط اور نئے تلازموں کی دریافت کا۔ اپنے دور میں غالب نے بھی یہ کیا تھا اور بیسویں صدی میں مستحکم ہونے والے نئے میلانات کی ترویج کرنے والے نئے شاعروں نے بھی یہی کیا۔ یہ مسئلہ ایک علاحدہ بحث کا تقاضا کرتا ہے۔ سر دست، میں اس سے گریز کا راستہ اپناتا ہوں اور موجودہ زمانے میں غالبؔ سے اپنی حسیت کا تعلق قائم کرنے والے ایک اور شاعر سرمد صہبائی کے کچھ شعر نقل کرتا ہوں۔ یہاں یہ یاد دلاتا چلوں کہ سرمدؔ صہبائی ایک مجنونانہ تخلیقی استعداد رکھنے کے باوجود، اپنے شعری اظہار کے معاملے میں بہت کفایت شعار رہے ہیں۔ ان کی نظم "تیسرے پہر کی دستک" اپنے اشتعال انگیز آہنگ اور اپنے وسیع ادراک کے باعث جدید سے مابعد جدید تک، نئی نظم کے کسی بھی نمائندہ انتخاب میں جگہ پانے کی مستحق ہے۔ برسوں کی خاموشی کے بعد پچھلے دنوں انھوں نے کچھ غزلیں کہی ہیں اور انداز و اسلوب وہی اختیار کیا ہے جو غالب سے منسوب ہے۔ ان کی غزل کے کچھ شعر سنیے:

عرصۂ خواب میں ہوں ہوش سے رخصت ہے مجھے
گردشِ شام و سحر ساغرِ غفلت ہے مجھے

اک مری لغزشِ پا سے ہے زمانے کو خرام
نغمۂ شہرِ سخن وقفۂ لکنت ہے مجھے

کیوں ہو تنہائی میسّر تجھے اے دل کہ جہاں
خود مرا سایہ بھی ہنگامۂ کثرت ہے مجھے

رونقِ باغِ عدم ہے مرے مرنے کا خمار
لذتِ آبِ فنا وعدۂ جنت ہے مجھے

اس خمِ زلف سے کھلتا ہے مقدر میرا
ظلمتِ چشمِ سیہ مطلعِ قسمت ہے مجھے

بے خبر رکھتا ہے یک رنگیِ عالم سے مجھے
اک تصوّر جو ترا موسمِ حیرت ہے مجھے

بسترِ درد بچھاتا ہوں تو نیند آتی ہے
زیرِ سر سنگِ جنوں بالشِ راحت ہے مجھے

جلوۂ دار دکھاتا ہے مجھے نخلِ بہار
غمزۂ لالہ و گل سنگِ ملامت ہے مجھے

بس کہ بیماریِ جاں میں بھی میں آرام سے ہوں
آمدِ شامِ بلا عیدِ عیادت ہے مجھے

منتِ مرگ ہو کیوں تو ہی بتا شامِ فراق
جب کہ ہر روز یونہی مرنے کی عادت ہے مجھے

جب سے لا حاصلِ جاں حاصلِ جاں ٹھہرا ہے
تنگیٔ فکرِ فراواں سے فراغت ہے مجھے

غزوۂ ہجر کی اس معرکہ آرائی میں
گوہرِ اشک دُرِ زخمِ غنیمت ہے مجھے

کیوں معاصر نہ ہو وہ غالبؔ آشفتہ مرا
میں ہوں پوشیدہ ولی کفر سے نسبت ہے مجھے

جلسۂ رسمِ سخن عام ہے لیکن سرمدؔ
اس کی آواز کہن لہجۂ جدّت ہے مجھے

میں چند شعر نقل کرنا چاہتا تھا۔ ایک ایک کر کے پوری غزل ہی آپ کو سنا ڈالی۔ یہ معاملہ بھی بھلا اردو کے اور کس شاعر کے ساتھ ہوا ہے کہ ہر دور میں اسے اس طرح اپنا معاصر تسلیم کر لیا جائے۔ غالبؔ کی انفرادیت کا کمال یہ ہے کہ اپنے تجربوں اور احساسات کو، لفظوں اور بیان کو، ایک خاص پہچان دینے کے باوجود، وہ اپنے چاروں طرف کوئی دیوار نہیں بننے دیتی۔ نہ وقت کی، نہ مقام کی، نہ فکر کی، نہ جذبے کی، نہ زبان کی، نہ بیان کی۔ دو چار شعر تو پرانے سے پرانے شاعر کے یہاں ایسے مل جائیں گے جن میں ہم اپنی ہستی یا اپنے زمانے کا عکس ڈھونڈ نکالیں۔ اس میں دیسی بدیسی کی بھی کوئی قید نہیں۔ ہر زبان اور ہر زمانے کی اداس اور پریشاں روحوں کو شاعری اسی طرح ایک میں یکجا کر دیتی ہے اور زبان، تہذیب، مسلک، عقیدے، زمانے کے اختلاف کے باوجود وہ آپس میں مکالمہ قائم کر لیتے ہیں۔ میرؔ، مصحفیؔ،

سوداؔ، دردؔ، قائمؔ، نظیرؔ سے لے کر ہمارے اپنے دور تک، ایسے بہت سے شعروں، نظموں، غزلوں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے جو اس دور کے طرزِ احساس سے مناسبت رکھتی ہوں اور ہمارے اپنے تجربوں یا گردوپیش کی حقیقتوں کی ترجمان کہی جاسکیں۔ لیکن غالب کے ساتھ تو قصہ ہی کچھ اور ہے۔ وہ اپنی کمزوریوں اور خوبیوں، اپنی ہزیمتوں اور اپنی کامرانیوں سمیت تمام وکمال ہمارے ساتھ آکھڑے ہوتے ہیں اور ان سے ذہنی وجذباتی رفاقت کا رشتہ استوار کرنے میں ہمیں دیر نہیں لگتی۔ ہر زمانہ، غالب کی شاعری میں اپنی ذہنی زندگی کے آثار دریافت کرلیتا ہے۔ ہر شخص غالب کو اپنے حساب سے پڑھتا ہے۔ اپنی تربیت اور ترجیحات کے مطابق ان سے معنی اخذ کرلیتا ہے۔

اور یہ صورت حال صرف اردو یا فارسی والوں سے مخصوص نہیں ہے۔ ملکی اور غیر ملکی زبانوں میں ہماری ادبی روایت سے شغف رکھنے والوں نے شاید سب سے زیادہ توجہ غالبؔ کی تفہیم وتعبیر اور ترجمے پر صرف کی ہے۔ اس ضمن میں، یہاں میں ہندستان کی مختلف زبانوں کے چند لکھنے والوں کی مثال دوں گا۔ ان کے کچھ اقتباسات کی مدد سے، مجھے عرض یہ کرنا ہے کہ غالبؔ نے اپنی فکر اور فنی حکمت عملی یا تخلیقی حربوں کی وساطت سے، بہ ظاہر مختلف اور نامانوس زمانی، مکانی، ادبی اور تہذیبی پس منظر رکھنے والے ادیبوں کے شعور میں بھی اپنی جگہ بنائی ہے۔ یہاں اپنی بات میں اشوک باجپئی کے ایک بیان سے شروع کرتا ہوں۔ یہ لفظ انہی کے ہیں۔ (ترجمے کے ساتھ)

> ہماری صورت حال، یعنی ہندوستانی صورت حال میں غالب پہلے جدید شاعر ہیں...... تین معنوں میں وہ تجدد کے، وہ پہلے کلاسیک ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کے یہاں فرد شاعری کے مرکز میں موجود ہے۔ بغیر کسی استواری جہت، بغیر کسی روایتی آدرش اور ایقان کے......ایک نہتے انسان کی شکل میں۔ دوسری بات غالب کا استفہامیہ مزاج ہے، ہر بات پر وہ سوال قائم کرنے کی جرأت (رکھتے ہیں) وہ دنیا کے تماشے پر سوال، اپنے وقت پر سوال اٹھاتے ہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ غالبؔ کے یہاں ہندی اور فارسی روایت کا ایک امتزاج، ایک معنی خیز باہمی ربط ملتا ہے۔ ہندی روایت کو غالبؔ کی شاعری میں ایک نئی

زبان ملی...... میرے پاس ایک مجموعہ ہے، دنیا کی مابعد الطبیعاتی شاعری کا...... اس میں ہندوستان کے جو شاعر لیے گئے ہیں...... وید اور اپنشد کے علاوہ، ایک حصہ گیتا کا ہے۔ گوتم بدھ کے کچھ کتھن ہیں...... اور پھر کبیر، میرا اور غالب۔

غالب کے بعد اردو شاعری وہ کچھ نہیں رہی جو غالب سے پہلے تھی۔ غالب تاریخ کے نہیں، ابدیت کے شاعر ہیں اور ہمارے لیے وہ یوں بامعنی بنتے ہیں کہ ہم سے وہ ایک ہم عصر کی طرح مکالمہ قائم کرتے ہیں۔

غالب انیسویں صدی میں نہ صرف ہندوستان کے سب سے بڑے شاعر تھے بلکہ دنیا کے سب سے بڑے شاعروں میں ہیں............ اپنی نگاہ کے پھیلاؤ میں، اپنی نئی وضع کی فکر میں، اپنے فلسفیانہ استدلال اور کھرے پن میں، اپنی جسارت مندی میں، اپنی بے چینی اور پریشاں نظری میں، غالب ایک بہت بڑی شخصیت کے طور پر ابھرتے ہیں۔ وہ ایک ایسی بڑی برادری کا حصہ ہیں جو ہمارے یہاں وید سے لے کر اب تک پھیلی ہوئی ہے۔

بات پھیلتی جارہی ہے اس لیے اشوک باجپئی کے بیان کو میں یہیں ختم کرتا ہوں اور کچھ جملے ملیالم کے ممتاز شاعر اور ہندستانی ادبیات کے معروف عالم سچدانندن کی گفتگو سے نقل کرتا ہوں۔ ان کا کہنا ہے کہ: (ترجمے کے ساتھ)

''میں صرف ایک قاری ہوں۔ میرا غالب سے اسی طرح کا تعلق ہے جیسا کہ بیسویں صدی کے کسی شاعر کا پہلے کی صدی کے عظیم پیش رووں سے ہوسکتا ہے...... اس طرح میں پاتا ہوں کہ وہ میرے اپنے ہم عصر ہیں، وہ مجھ سے ایک جدید شاعر کی طرح بات کرتے ہیں۔

جو سوال غالب نے اٹھائے وہ فارسی، اردو شاعری سے وابستہ روایتی سوالوں سے بہت مختلف نہیں تھے۔ عشق کیا ہے؟ خدا کیا ہے؟ کائنات میں انسان کی حیثیت کیا ہے؟...... لیکن ان کے جواب مختلف ہیں۔ ان کے جواب انسانی رشتوں کی ایک نئی دستاویز سامنے لاتے ہیں۔ دنیاوی اور ماورائی عناصر ایک ساتھ ان کے یہاں اظہار پاتے ہیں۔

انھیں ایک نئی زبان، ایک نئے شعری محاورے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اسی لیے زبان کے روایتی مذاق کو وہ قبول نہیں کرتے۔ ایک ادیب کی حیثیت سے غالبؔ کی عظمت یہی ہے کہ وہ ایک نیا محاورہ تلاش کرتے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ وہ مستقبل کی زبان گڑھ رہے ہیں۔ طمانیت کے خاتمے اور تشکیک کا ایک نیا تجربہ اپنے اظہار کے لیے نئی زبان چاہتا تھا۔ غالبؔ نے شاعر کا روایتی رول اختیار کرنے سے انکار کیا ہے..........

غالبؔ کی شاعری اور شخصیت میں ایک مستقل تحرک کا اور زندہ انسانی عناصر کی شمولیت کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی شخصیت نئی بھی ہے، پرانی بھی۔ اپنی مخصوص پہچان کی تابع بھی ہے اور اتنی وسیع بھی کہ ایک ساتھ بہت سے اور مختلف انسانی اوصاف کو، تضادات کو اپنے اندر جذب کرلے۔ اسی طرح غالبؔ کی شاعری، شاعر کے روایتی رول اور ایک روایتی معاشرے کے مطالبات سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ نئی زندگی اور معاشرت کے تقاضوں سے بھی ہم آہنگ دکھائی دیتی ہے۔

ہم غالبؔ کو اسی طرح پڑھتے اور سمجھتے ہیں جس طرح اپنے آپ کو۔ تمام خوش فہمیوں اور فریبوں سے، رسوم و روایات کی تمام بندشوں سے، تمام مصلحتوں اور مجبوریوں سے آزادی کا اور مجبوری کے ساتھ ساتھ ایک طرح کی وجودی خودمختاری کا ایسا اظہار ہمیں اردو کے کسی دوسرے بڑے شاعر کے یہاں نہیں ملتا۔ غالبؔ کی شاعری میں معنی کی تکثیر کے ساتھ ساتھ لفظ و بیان کے امکانات کی رنگارنگی بھی بے مثال ہے۔ غالبؔ نے شعریات کے کسی جامد تصور کے سامنے نہ تو ہار مانی، نہ شعریات کا کوئی ایسا نظام وضع کرنے کی کوشش کی جس کے ضابطے متعین اور بے لوچ ہوں۔ لہٰذا کسی بندھے ٹکے اصول کے مطابق ان کی تفہیم و تعبیر بھی ممکن نہیں ہے۔ مرتب فکر اور مرتب زندگی کے اپنے فائدے بھی ہوتے ہیں۔ مگر ایسی فکر اور ایسی زندگی کی کچھ مجبوریاں، معذوریاں اور حدیں بھی ہوتی ہیں۔ غالبؔ نہ اپنے ماضی سے مرعوب تھے، نہ اپنے حال سے اتنے خوف زدہ کہ انھیں تلاش کو حوصلہ چھوڑ بیٹھتے۔ اس لیے انھوں نے نہ تو اپنے پیش رووٗں کی روایات پر تکیہ کیا، نہ اپنے عہد کی اطاعت قبول کی۔ زندہ رہنا ایک طرح کی بے بسی میں مبتلا ہونا سہی، مگر غالبؔ کی طبیعت کسی بھی مقدر کو بے چون و چرا قبول

کر لینے پر آمادہ نہ تھی۔ سارتر کے ایک کردار (Reprieve کے میتھیو) نے کہا تھا:

''ایک انسانی وجود کے لیے ''ہونے'' کا مطلب اپنے آپ کو منتخب کرنا (پہچاننا) ہے۔ اسے نہ تو اپنے خارج سے کچھ ملتا ہے، نہ اپنے اندروں سے، جسے وہ وصول یا قبول کر سکے۔ پس آزادی (بجائے خود) ہستی نہیں ہے۔ یہ انسان کی ہستی ہے یعنی (گرد و پیش کی دنیا میں) نہ ہونا۔''

یہی کردار پھر کہتا ہے:

''اندروں (باطن) کچھ بھی نہیں۔ یہاں کچھ بھی نہیں۔ میں کچھ نہیں۔ میں آزاد ہوں۔''

غالبؔ کا، ڈائلما بھی یہی ہے اور ان کی الجھن کا سبب بھی یہی ہے کہ خود کو آزاد سمجھیں یا گرفتار۔ یہ سوال ہر عہد کے سوچنے والے انسان کا آشوب ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہر زمانہ اور زندگی کے تئیں ہر زاویۂ نظر غالبؔ سے اور تفہیم غالبؔ سے اپنا ایک الگ معاملہ رکھتا ہے۔ خود غالبؔ نے اپنی ذہنی کش مکش کی تعبیر یوں کی تھی کہ:

آہنگ اسدؔ میں نہیں جز نغمۂ بیدلؔ
''عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ''

●●●